Regd. No. A. [illegible]
Telephone No. [illegible]
Telegram: "ANJUMAN"

قیمت سالانہ تین روپے
ایک پرچہ کے دس پیسے
تاریخ اشاعت
۱ ، ۸ ، ۱۵ ، ۲۲

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

جلد ۱۶ | علی گڈھ - یکم مئی ۱۹۵۷ ع | شمارہ ۱۷

عوام سے رابطے کی زبان

نریندر شرما

عوام سے رابطہ قائم کرنے کے ایک ذریعے کے طور پر کسی زبان میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں، یہ سوال اکثر بحث کا موضوع رہا ہے اور ایک ایسے دور میں جبکہ ایک جمہوری فلاحی ریاست کا نصب العین ایک سیاسی نظریے کے طور پر ہمہ گیر مقبولیت حاصل کر چکا ہے یہ امر قدرتی ہے کہ لوگ ایک ایسی زبان کی نشو و نما کے طریقوں میں دلچسپی لیں جو عوام سے رابطے کا ذریعہ بن سکتی ہو۔

اس سوال کا جواب اکثر اوقات ایسے لوگوں کی طرف سے دیا گیا ہے جو بدقسمتی سے کسی قدر کٹھن سوالات کو بھی حد سے زیادہ سہل بنا کر پیش کرنے کے عادی ہیں۔ ایک سادہ زبان براہ راست کشش خیالات و تصورات کو واضح طور پر پیش کرنے کی اہلیت، ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ پُر معنی ہونا ـــــ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی غرض سے قبول کی گئی، زبان کی نشو و نما میں ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ عام طور پر اُسے سمجھا جاتا ہے۔

آئیے ہم ایک ایسی ہندی زبان کی نشو و نما کے سوال پر غور کریں جو عوام کے ساتھ رابطے کا موثر ذریعہ بن سکے ملک کے کسی اور حصے میں شہر اور گاؤں کے درمیان اور اونچے طبقے اور عوام کے درمیان خلیج اتنی وسیع نہیں ہے جتنی کہ ہندی بولنے والے علاقوں میں ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہندی بولنے والے علاقے بہت سے ایسے خطوں پر مشتمل ہیں جن میں عام مقامی یا گھریلو استعمال کے واسطے ان کی اپنی بولیاں موجود ہیں۔

بہٰذا یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ اس سماجی اقتصادی اور تہذیبی تنوع کی بوقلمونی کے باوجود تمام ہندی بولنے والے اشخاص نے ادبی اظہار و بیان کے واحد ذریعے کے طور پر تحریری ہندی کی ایک ایسی شکل قبول کی ہے جو سبھی کے لئے قابل قبول ہے۔

پھر بھی ملک کے کسی اور حصے میں عوام کی لکھنے کی زبان اور بول چال کی زبان میں اتنا زیادہ بعد نہیں ہے جتنا ہندی بولنے والے علاقوں میں ہے۔ اسی سلسلے میں کیا میں یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ بھارت کے دوسرے بہت سے حصوں کی بہ نسبت ہندی علاقوں میں ان پڑھ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔

اس لئے عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لئے قبول کی گئی زبان کی خصوصیات پر غور کرتے وقت ان باتوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہوگا۔ اگر ایسی زبان کے علاقائی کردار پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا تو اس سے قرون وسطیٰ کے زمانے کو دور جدید میں جدت کی تحریک کو جو ہمارے سماج کی کایا پلٹ کے لئے بہت ضروری ہے دھکّا پہنچے گا لیکن اس کو حد سے زیادہ معیاری بنانا بھی ٹھیک نہ ہوگا کیونکہ اس سے اس میں بے رنگی و خشکی پیدا ہو جائے گی۔ الفاظ کے مختلف علاقائی بدل استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہو جائے گی جب صرف چند چیزوں کے واسطے بہت سے الفاظ استعمال کرنے پڑیں گے لیکن اگر معیاری الفاظ وضع کئے جائیں تو چند الفاظ ہی کافی ہوں گے، یہ امر یقینی ہے کہ زبان کو معیاری بنانا مفید ہوگا۔

آج کل جبکہ ہمارے عوام میں بہت بڑی تعداد ناخواندہ لوگوں کی ہے، اچھا ہے کہ زبان عوام سے رابطہ کا ذریعہ بنانے کا امکان بہت کم ہے۔ بہٰذا یہ ضروری ہے کہ عوام سے رابطہ قائم کرنے کی زبان بول چال کی زبان کی حدود و قیود سے بالاتر ہو۔ ممکن ہے یہاں یہ دلیل پیش کی جائے کہ بول چال کی زبان میں چونکہ الفاظ کا انتخاب احتیاط سے کیا جاتا ہے اس لئے ان کا حسن زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ بہ نسبت زبان کے ادا

گئے چھپے الفاظ کے، جن میں اگرچہ فوری اثر اور ایک کشش ہوتی ہے لیکن محض عارضی نوعیت کی۔ سامعین میں سے بہتوں کو عین کامیاب مشاعروں میں شاعروں کی زبان سے ان کا کلام سننے کا موقع ملا ہوگا شاعر کی زبان سے اس کا کلام سننے کا اثر فوری طور پر ہوتا ہے اور لوگ اس سے کافی محظوظ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں نے شاید یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بعد میں وہی کلام جب چھپ کر سامنے آتا ہے اور وہ اسے خود پڑھتے ہیں تو وہ کس قدر مایوس کن نظر آنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں وہ خوبیاں نہیں ملتیں جو شاعر کی زبان سے سنتے وقت دکھائی دے رہی تھیں

اگر عام اشعار یا نظمیں مشاعروں میں محض شاعر کی شخصیت اور ماحول کی وجہ سے اتنی خوبصورت و دلکش بن جاتی ہیں تو خیال فرمایئے کہ پھر اچھی شاعری اگر چھاپے کے الفاظ کے بجائے زبانی طور پر پیش کی جائے تو وہ کتنی زیادہ دلکش اور اثر آفریں ہو سکتی ہے۔ دراصل اب وقت آگیا ہے کہ ہماری زبان کی لکھاوٹ اور بول چال کی بھاشا کے درمیان جو تضاد یا تناقض موجود ہے اسے ختم کیا جائے اور ان کے امتزاج سے ایک ایسی زبان پیدا کی جائے جو ریڈیو پر استعمال کی جائے اور عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر اپنے وجود کو بجا اور برحق ثابت کر سکے۔

آج کا گجراتی افسانہ

انَنت رائے راول

دوسری جگہوں کی طرح گجرات میں بھی افسانہ ادب کی ایک نہایت مقبول چیز ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ افسانوی ادب کی کتابیں بڑے پیمانے پر شائع ہوتی ہیں اور دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے اس وقت دو قسموں کے ناول رائج ہیں ایک سماجی دوسرے تاریخی۔ پہلے نظام کے نئے نظام میں تبدیل ہونے کا جو عمل مغرب کے اثر کے تحت شروع ہوا تھا اور جس کی خاکہ کشی کی کوشش گوبردھن رام نے اپنی لافانی تصنیف "سرسوتی چندر" میں کی تھی، ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ملک کی تعمیر نو کی قومی مساعی اور گاندھی جی اور ان کے بعد ونوبا بھاوے کے پیغام کی بدولت اس کی رفتار اور تیز ہو گئی ہے ان اثرات کے تحت جس انداز سے گجرات کی تشکیل نو کا کام ہو رہا ہے اس کی جھلک گجراتی کے سماجی ناولوں اور مختصر افسانوں میں ملتی ہے۔

ادب میں حقیقت پسندی اور زندگی میں انسان دوستی اور سماجی انصاف کی مانگ کے زیر اثر گجراتی زبان کے سماجی ناول اور افسانے زندگی سے اور بھی قریب ہو گئے ہیں اور انھوں نے دیہی اور شہری عوام کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور ترقی کی جانب گجراتی ناول کا یہ ایک بڑا قدم ہے۔ اس کا ایک ثبوت پنا لال پٹیل کی رومانی کہانی "ملیلا جیو" ہے جس میں حقیقی دیہی زندگی کے پس منظر میں سیدھے سادے بے تکلف دیہاتیوں کا بے پناہ جذبۂ محبت پیش کیا گیا ہے۔ پنا لال نے اسی قسم کے پانچ ناول اور لکھے ہیں، جنھیں اتفاق رائے سے ان کے شہری زندگی کی عکاسی کرنے والے ناولوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے

پنا لال کے ہم عصروں مثلاً ایشور پٹلیکر، چنی لال ماڈیا، پیتامبر پٹیل اور پنشکر جبندراد کر نے بھی اسی قسم کے ناول لکھنے کی کوشش کی ہے۔

جس طرح نئے اور نوجوان مصنفوں نے سماجی ناول لکھنے پر توجہ مبذول کی ہے اسی طرح پرانے اور بزرگ مصنفین بھی تاریخی ناول لکھنے میں مصروف رہے۔ نوجوان مصنفوں میں صرف دو ایک ہی ایسے ہیں جنھوں نے تاریخی ناول لکھنے کی کوشش کی ہے اور اس میں انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔

اگرچہ مختصر افسانہ ناول سے ایک بالکل مختلف چیز ہوتا ہے تاہم یہ حسن اتفاق ہے کہ قریب قریب تمام ناول نگار جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اچھے افسانہ نگار بھی ہیں اور دھوم کیتو" اور ※

※ رام نرائن پاٹھک کے بعد گجراتی مختصر افسانے کو ترقی دینے کا سہرا نوجوان مصنفین ہی کے سر ہے

اس دور کے دو شاعروں سندرم اور اوما شنکر نے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ موخرالذکر کہانی کو زیادہ نفسیاتی اور مبنی بر حقیقت بنانے اور تکنیک اور نفس مضمون میں جدت پیدا کرنے میں زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ اُما شنکر کے بعد پنا لال اور چنی لال ماڈیا نے مختصر افسانوں کا دامن مالا مال کیا ہے۔

گلاب داس بروکر اور جینتی دلال کے نام بھی قابل ذکر ہیں بروکر اپنی کہانیوں کا موضوع شہر کے متوسط طبقے سے حاصل کرتے ہیں اور دلال گجراتی کہانی کو مغرب کے مختصر افسانے کے ہم پایہ بنانے کے لئے تکنیک اور ہیئت وغیرہ کے سلسلے میں نئے نئے تجربات کرتے ہیں۔

گجراتی افسانے اور ناول اس وقت تک اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ گجراتی زبان ان پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

دفتری خط و کتابت صرف جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کے پتے پر کیجئے۔

ہماری زبان

یکم مئی ۱۹۵۷ء

کتاب دان

اردو کی بہت سی نادر کتابیں، اچھے اچھے رسالے، مخطوطات، بیاضیں، ابھی ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ پرانے زمانہ میں صاحب ذوق حضرات کتابیں ضرور جمع کرتے تھے اور بعض اوقات بڑی محنت و تلاش سے نوادر فراہم کرتے تھے۔ حالات بدل جانے کے بعد یا تو نادر کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت ہو گئیں یا الماریوں میں بند پڑے پڑے دیمک کی نذر ہو گئیں۔ ایسا بھی ہوا کہ بزرگوں نے بڑے چاؤ سے مشرقی علوم کا ذخیرہ جمع کیا مگر ان کی اولاد کو ان کی اہمیت کا یا تو علم ہی نہ ہوا یا احساس نہ ہو سکا اور وہ منتشر ہو گیا۔ موجودہ اقتصادی دشواریوں میں افراد کے لئے ان کتابوں کا رکھنا دشوار ہے اس لئے ہر اردو دوست کا یہ فرض ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو اپنی اچھی کتابوں کو مستند ادبی یا تعلیمی اداروں کے حوالے کر دے۔ عام طور پر یونیورسٹیوں میں جو کتب خانے ہوتے ہیں، ان میں کتابوں کی حفاظت کا پورا پورا انتظام ہوتا ہے۔ اس وقت بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، رضا لائبریری رام پور، خدا بخش لائبریری پٹنہ، سالار جنگ اسٹیٹ میوزیم، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند اور بہت سے اچھے کتب خانے موجود ہیں۔ ان کتب خانوں کی اور مدد کرنی چاہئے۔ اگر لوگ اپنے اپنے ذخیرے ان اداروں کی نذر کر دیں تو یہ ایک اچھی خدمت ہوگی۔ اگر مالی وسائل اس کی اجازت نہ دیں تو کتابیں فروخت بھی کی جا سکتی ہیں۔ مگر موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے "کتاب دان" کی ایک وسیع تحریک کی ضرورت ہے جو لوگ مالی طور پر اردو کی تحریک کی مدد نہیں کر سکتے وہ اپنے ذخیرے کو کسی علمی و ادبی ادارے کی نذر کر کے بھی اردو کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔ کتابوں کے علاوہ اچھے اخباروں اور رسالوں کے فائل بھی محفوظ ہونا چاہئیں۔ خصوصاً پرانے اخباروں میں اودھ اخبار، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اودھ پنچ، مشرق، مسلم گزٹ، الہلال، ہمدرد کے فائل ضرور محفوظ ہونے چاہئیں۔ رسالوں میں دلگداز، معارف، [illegible]، اردوئے معلی، ادیب الہ آباد، حسن حیدرآباد، نقاد، صلائے عام، صبح امید، ہمایوں، اردو، نگار، جامعہ، ہندستانی، ادبی دنیا، شاہکار، معیار، زمانہ، خیابان، شمع، مخزن ایسے کتنے ہی جواہر پارے ہیں جو عام طور پر لوگوں کے سامنے نہیں آئے۔ کچھ کتب خانوں میں ان رسالوں کے فائل بھی کچھ ہی ہیں۔ بعض افراد نے اپنے شوق سے رسالے بھی جمع کئے تھے۔ اب وقت ہے کہ وہ انہیں مشہور کتب خانوں میں کسی نہ کسی طرح محفوظ کر دیں۔ ہماری ادبی تاریخ کے مرتب کرنے میں ان سے بڑی مدد ملے گی۔ ان سے پورا پورا کام لے لیا جائے تو اردو ادب کے تسلسل، اس کی جامعیت، گہرائی، تنوع اور رنگا رنگی کا صحیح نقشہ دنیا کے سامنے آئے گا۔ اور یہ ایک ایسا معجزہ ہوگا جس کے سامنے بڑے بڑے ساحروں کے طلسم باطل ہو جائیں گے۔

شبلی کی پیدائش کی صد سالہ یادگار

شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بعض حلقوں سے یہ تحریک اٹھی ہے کہ امسال شبلی کی پیدائش کی صد سالہ یادگار منائی جائے۔ ہم اس تحریک کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ شبلی صرف اردو کے بہت بڑے مصنف ہی نہ تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے مصنفوں کی تربیت کی اور اردو ادب کے ہر گوشے پر اپنی شخصیت کا ایک گہرا نقش چھوڑا۔ تاریخ، فلسفہ، مذہبیات، سوانح، انشا، سیاست، خطوط نویسی، تعلیم، شاعری، ہر صنف میں انھوں نے اضافہ کیا اور نظم و نثر دونوں کو اپنے دلکش اور شوخ انداز بیان سے زیادہ جاندار اور ہمہ گیر بنایا۔ وہ بہت بڑے محب وطن تھے اور اس زمانے میں جب بڑے بڑوں کی زبانیں بند تھیں نہایت جوش و خروش سے قومی تحریکوں کی حمایت کرتے تھے۔ شبلی کی یاد میں دن منانا کافی نہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ان کی شخصیت اور کارناموں کے متعلق ایک ایسی کتاب لکھی جائے جو ایک طرف پیرپرستی اور عقیدت سے آزاد ہو، دوسری طرف اس میں ان کی اہمیت کا صحیح جائزہ لیا جائے۔ یہ کام ہمارے قومی ادارے ہی کر سکتے ہیں۔ ویسے حکومت کو بھی چاہئے کہ اس اعتراف میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ضروری ہے کہ دارالمصنفین اور شبلی اکیڈیمی مالی مشکلات کا شکار نہ ہونے پائیں اور علمی تحقیق کا یہ ادارہ بے کھٹکے اپنے مفید کام میں مصروف رہے۔ شبلی ہر تعریف سے مستغنی ہیں۔ ان کا اعتراف اپنی صلاحیت کا اعتراف ہے۔ ہاں ان کے کارناموں کو یاد رکھنا اور ان کے کام کو جدید خیالات کی روشنی میں آگے بڑھانا ہمارا فرض ہے۔

رفتار کا کالم

یہ کالم اس لئے شروع کیا گیا تھا کہ ہماری زبان کے پڑھنے والے جدید علمی و ادبی مسائل اور میلانات سے واقف رہیں۔ اس کے لکھنے والے خلیل الرحمن اعظمی ہمارے نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی رائے سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ادبی

مسائل پر سنجیدہ اور سوچے ہوئے خیالات آپ کے سامنے آتے رہیں۔ ان کی بعض تحریروں سے کچھ لوگوں کو اتفاق ہے اور کچھ کو اختلاف۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ مراسلات کے کالم میں ضروری حصے آجائیں لیکن ایک ہفتہ وار پرچے میں نہ تو ادبی بحثوں کے لئے زیادہ گنجائش ہے اور نہ ہم ذاتی یا محض طنزیہ خیالات کی اشاعت کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کالم ادھر چند مصروفیات کے باعث وقت پر نہیں آسکا آئندہ اشاعت سے باقاعدہ جاری رہے گا۔

رفتار

سلیمان اریب صاحب

ادھر کچھ دنوں سے ہماری زبان میں "رفتار" کے عنوان سے خلیل الرحمن اعظمی نے مختلف ادبی مسائل پر لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے بہت خوب اور دلچسپ ہے۔ میں اسے تقریباً پابندی سے پڑھتا ہوں

اعظمی بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن وہ ایک اچھے نقاد بھی بن سکتے ہیں۔ آتش، غالب، حسرت اور جوش وغیرہ پر ان کے مضامین ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے ثبوت کے لئے کافی ہیں لیکن اعظمی بھی بعض ان شاعروں اور نقادوں کی طرح جو اس لئے ان کی تنقیدوں کا ہدف بنتے ہیں کہ انتہا پسند ہیں، پروپیگنڈسٹ ہیں اور جانے کیا کیا ہیں خود انتہا پسندی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اکثر موقعوں پر ان کا لب و لہجہ تنقیدی سطح سے گر جاتا ہے اور وہ سچی بات بھی اس انداز سے کرتے ہیں کہ بادی النظر میں صحیح نہیں معلوم ہوتی جیسے "فکر و نظر" میں جوش کی شاعری پر ان کا مضمون۔ علاوہ ازیں ان کا دامن بھی گروپ بندی، دوست نوازی اور مصلحت اندیشی کی گرد سے جس کے وہ سخت مخالف ہیں پاک نہیں۔

"رفتار" کے عنوان کے تحت اعظمی جو آرٹیکلس لکھ رہے ہیں اور ان میں براہ راست یا ضمنی طور پر بعض مسائل یا شخصیتوں پر انھوں نے جس نقطہ نظر سے روشنی ڈالی یا تنقید کی ہے اسے ہمارے بہت سے ترقی پسند ساتھی اور بزرگ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اعظمی نہ ترقی پسند تحریک کے دشمن ہیں اور نہ ادب کے۔ ان کو اپنے خیالات کے آزادانہ اظہار کا حق ملنا چاہئے۔ صحیح تنقید تو ایک نعمت ہے جس کو اگر ہم برداشت نہیں کر سکتے تو پھر ہم اپنی اصلاح بھی نہیں کر سکتے لیکن سوال یہ ہے کہ اعظمی بھی کہاں تک تنقید کا حق ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ۸۔ اپریل ۱۹۷۰ء کی ہماری زبان کی اشاعت میں انھوں نے نئی غزل اور نئی نئی ردیفوں کی اختراع اور زمینوں کی تلاش کے متعلق جو آرٹیکل لکھا ہے اس میں بھی یہی خامی ہے۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جدید شاعروں نے اب اردو غزل کے ساتھ مذاق کرنا شروع کر دیا ہے۔ یا پھر وہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے شاعر تو دس دس سال تک خاموش رہ کر زندگی گزار سکتے ہیں لیکن دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعر اپنے فن اور اپنی شخصیت پر اعتماد نہ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ اپنا نام چھپا ہوا دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر دو چار سال رسالوں میں ان کی کوئی چیز نظر نہ آئی تو ان کا نام ورق جہاں سے یکسر مٹ جائے گا اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے مارے باندھے کی *

* جو بھی شاعری ہوگی اس کا مصنوعی ہونا ضروری ہے۔"

یہ دونوں باتیں یقیناً اپنی جگہ درست ہیں اور ان کا اطلاق بہت سے جدید شاعروں پر ہوتا ہے۔ لیکن اعظمی صاحب نے سب جدید شاعروں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا ہے۔ جو لوگ اردو رسائل کا پابندی سے مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کون زیادہ چھپتا ہے میں یا اعظمی؟ خود اپنے رسالے "صبا" میں دو سال کی مدت میں میری دو غزلیں شائع ہوئی ہیں۔

اسی طرح شاہ نصیر وغیرہ کے رنگ کی مثالیں جدید شاعروں کے کلام سے دیتے ہوئے انھوں نے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں میری ایک غزل کے یہ دو شعر ہیں

آنکھوں پہ الزام بہت ہیں — خود بہت ہیں بام بہت ہیں
لب پہ آہیں سینے خالی — ایسے عاشق عام بہت ہیں

بھی دے دیئے ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے الفاظ میں "ذوق کی زمین اور مضحکہ خیز ردیف و قوافی میں طبع آزمائی" یا "جن غزلوں کو پڑھنے کے بعد ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے" یا "واقعی شعر کہنے کا عمل یہ ہے کہ خود شاعر اس کی لپیٹ میں آگیا" کی تعریف میں نہیں آتے میں اہل نظر اور اہل انصاف پر اس کا فیصلہ چھوڑتا ہوں۔

حیرت ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی کو اور بہت سی مضحکہ خیز مثالیں کیوں یاد نہ آئیں۔ جانے دوستی کی بنا پر یا مصلحت کی بنا پر جیسے:

دم زباں مست ہوا دم تنا تا ہو رہا ہے (جعفر طاہر)
آشا کی کلیوں کا کھلنا ایک کھٹکتا غم ہے (عدم)
ساقی کی رنگین جوانی ایک چھلکتی مٹکی ہے (")
دے جام چھلکتا جام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے (عقیل شگفتائی)
دے جام میں بھر کر پھول کہ ساقی بادل گھرنے والے ہیں (")
مجھے کبھی رنگ چمن جان گلستاں کہیے (شہزاد احمد)

یا جن غزلوں میں ردائے باقی تبائے خواجہ جیسی ردیفیں رکھی جاتی ہیں۔

گوپی چند نارنگ

ہماری زبان کے تازہ شمارہ میں کرمی حسن عسکری لکھنوی اور واثق جونپوری صاحب کے خطوط نظر سے گزرے۔ پہلے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ہماری زبان کے ہر شمارے کو غور سے نہیں پڑھتے ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ کرمی اثر لکھنوی سے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی اس کا ازالہ ہو چکا ہے۔ تنقید نہ بت گری ہے نہ بت شکنی۔ خود واثق صاحب کا خط شاہد ہے کہ "نزدیک" اور "دور" کے جس پیمانے کا ذکر عسکری صاحب نے کیا ہے وہ غلط ہے۔ ہر اچھی تنقید کا نقطۂ نظر زیادہ سے زیادہ معروضی ہوتا ہے۔ اگر رفتار پر ذاتیات کا اثر پڑا ہے تو زیادہ خوشگوار نہیں۔ حوالہ واثق صاحب کے اس شعر کا دیا گیا تھا جو انھوں نے اردوئے معلیٰ کے جلسے میں پڑھا تھا۔ نہ اس کا جو انھوں نے دراصل کہا ہوگا۔ ہماری زبان کے قارئین ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اصل شعر اور اس کی شانِ نزول بتا دی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رفتار کی رفتار کم کردی جائے۔ اس میں بعض باتیں پتے کی ہوتی ہیں اور ان سے سنجیدہ علمی مسئلے سامنے آتے رہتے ہیں۔

شوقؔ، مدیر عارف، لاہور

ہماری زبان میں کرمی تحسین الدین اعظمی کی رفتار، اگرچہ کبھی تیز بھی ہو جاتی ہے، دیکھنے کے قابل ہے۔

گزشتہ شمارہ (ہماری زبان، شمارہ نمبر ۹) میں ان کے قلم سے ایک دفعہ نہیں دو دفعہ "چند سالوں" کا فقرہ نکل گیا ہے۔ جو مجھ ایسے پنجابی کی سمع میں بھی غیر مانوس معلوم ہوتا ہے۔ میرا ناچیز خیال ہے اہلِ قلم و اہلِ زبان "چند سال" یا "چند برسوں" کی بجائے چند سالوں نہیں لکھتے۔

پرانی کتابوں کی حفاظت

"ہماری زبان" برابر دیکھتا رہتا ہوں۔ انجمن کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس کے کسی اخبار یا رسالے کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ "ہماری زبان" میں اردو اخبارات و رسائل کا عنوان ایک بہت ہی مفید اور اچھوتا موضوع ہے۔ لیکن اس عنوان کے معلوماتی پہلو کو کچھ اور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ جس طرح آپ نے ایک نیا عنوان شروع کیا ہے اگر اسی قسم کا ایک دوسرا عنوان "کتابیں جو دم توڑ رہی ہیں" شروع کر دیں تو ایسی بہت سی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں اور مخطوطات کے متعلق بہت کچھ مواد فراہم کیا جا سکتا ہے جو نایاب ہوتی جا رہی ہیں یا زمانے کی دستبرد کی نذر ہو کر اپنی زندگی کی آخری منزلوں پر پہنچ چکی ہیں۔

یو۔ پی، دہلی، حیدرآباد، بمبئی اور بھوپال میں انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کی کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ مٹ چکا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی چند روز میں تلف ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں انجمن کو ایک خاص تحریک چلانا چاہئے اور ایک لائبریری قائم کر کے انھیں محفوظ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس مسئلے میں میں آپ سے تفصیلی خط و کتابت کرنا چاہتا ہوں اگر آپ اس کا موقع دیں۔

، نادم سیتاپوری

سردار لابھ سنگھ کا انتقال

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ امریک آنند صاحب ایڈیٹر پگڈنڈی امرتسر کے والد بزرگوار سردار لابھ سنگھ کا ۵ اپریل ۵۵ء کو انتقال ہوگیا۔ پاٹھ کا بھوگ بھی ۱۱ اپریل کو تھا۔ ہمیں امریک آنند صاحب کے ساتھ دلی ہمدردی ہے اور ان کے غم میں شریک ہیں۔

اردو کانفرنس

انجمن ترقی اردو ہند کی مجوزہ کانفرنس علی گڑھ میں ۳۰، ۳۱ جولائی ۵۵ء کو منعقد ہوگی

پروگرام عنقریب شائع ہوگا اور مدعو حضرات کی خدمت میں بھیجا جائے گا۔

انجمن کی خبریں

حیدرآباد۔

حیدرآباد کا روزنامہ سیاست رقمطراز ہے کہ اردو کے ممتاز ادیب جناب مالک رام نے اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد میں سرکردہ ادیبوں اور شاعروں اور انجمن عوامی پسند مصنفین کے اراکین کو مخاطب کیا

ابتدا میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب معتمد عوامی انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے عزیز مہمان کا خیر مقدم کیا اور مالک رام صاحب کی ادبی خدمات کا ذکر کیا۔

جناب مالک رام صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ کوئی زبان محض حکومت کی سرپرستی یا بل بوتے پر فروغ نہیں پاسکی اگر زبانوں نے ترقی کی ہے تو وہ عام لوگوں کی توجہ اور ادیبوں کی کاوشوں کی رہین منت ہیں مالک رام صاحب نے فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض گوشوں سے اردو کے متعلق تنگ نظری اور عدم رواداری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اردو بولنے والوں کو اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندی ادب میں اردو کو ایک اہم اور زبردست رول ادا کرنا ہے۔

جناب مالک رام صاحب نے فرمایا کہ ہندی اور اردو کا جھگڑا بے معنی سی بات ہے ان دونوں زبانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر اردو ترقی کرتی ہو تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہندی فروغ پاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں زبان والے اپنے دل و دماغ کو ہر قسم کے تعصبات سے پاک رکھیں اور انسانی تنگ نظری سے آلودہ نہ ہونے دیں۔

آخر میں مالک رام صاحب نے بتایا کہ اردو کی بعض شاہکار تصانیف اور ادب عالیہ کے بعض نسخوں کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

سرینگر (کشمیر)۔ یوم اقبال

۲۲۔ اپریل کو ایس۔ پی کالج سرینگر میں انجمن ترقی اردو کشمیر کے زیر اہتمام یوم اقبال کی تقریب منائی جا رہی ہے۔ جس میں اقبال کے فکر و فن اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں ہوں گی اور مضامین پڑھے جائیں گے۔ اجلاس کے خاتمے پر ایک مختصر سی محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوگی۔ جس میں مندرجہ ذیل شعرا کی شرکت متوقع ہے:

جناب علی جواد زیدی
جناب کمال احمد صدیقی
جناب غالب کشمیری
جناب شہ زور کشمیری
جناب میر غلام رسول نازکی۔ جناب عبدالحق برق۔ جناب راہی معصوم رضا۔ جناب قیصر قلندر۔ جناب کمال الدین شیدا
جناب تنہا انصاری
جناب شوریدہ کاشمیری
اکبر جے پوری۔ جناب رسا جاودانی۔ جناب اختر ٹونکی۔ جناب خضر مغربی۔ جناب صادق علی اسیر۔

سندیلہ (یوپی)

انجمن ترقی اردو سندیلہ کی شاخ کے عہدیداروں کا نیا انتخاب حسب ذیل ہے

جناب محمد اطہر صاحب نفیس سندیلوی صدر۔ جناب پنڈت گرجا شنکر کھنڈیلوال نائب صدر۔ جناب مولانا حکیم چودھری عبدالمجید صاحب صدیقی جنرل سکریٹری جناب چودھری ذکاء اللہ جوائنٹ سکریٹری۔ جناب پنڈت چندر سین صاحب جوائنٹ سکریٹری۔ جناب شمس الحسن صاحب صدیقی جوائنٹ سکریٹری۔

اعزازی انچارج صاحبان مکاتیب محلہ برائے خواندگی ناخواندگان

۱۔ جناب شہزاد علی صاحب ۲۔ جناب چودھری محمد سلیم صاحب۔ ۳۔ جناب منشی محمد حسین صاحب ۴۔ جناب چودھری سمیع رضا فاریابی صاحب

غزل

محروم ہی رہیں گے قبول دعا سے ہم
ہرگز تمھیں نہ مانگ سکیں گے خدا سے ہم

بڑھتے نہ اس قدر کبھی طوفاں کے حوصلے
پتوار چھین لیتے اگر ناخدا سے ہم

نیرنگیٔ بہار گلستاں کا ماجرا
اک عمر پوچھتے رہے باد صبا سے ہم

عیش و نشاط صحبت یاراں کا ذکر کیا
رو بھی سکے نہ مل کے کسی ہمنوا سے ہم

اکثر تلاش ساحل ہستی میں اے ندیم
ٹکرا کے لوٹ آئے ہیں موج فنا سے ہم

خاموشیوں میں رات کی الجھے ہیں بار بار
چشم سخن طراز کی اک اک ادا سے ہم

اے نقش اب وہ ساتھ مرا چھوڑتے نہیں
کل تک تھے جن کے واسطے ناآشنا سے ہم

ستیش چندر نقش

اردو دنیا

آندھرا اسمبلی میں اردو

(ماخوذ روزنامہ سیاست حیدرآباد کے شکریے)

حیدرآباد ۱۸ اپریل۔ اسپیکر آندھرا پردیش اسمبلی مسٹر اے کالیشور راؤ کو آج ایوان میں ایک رکن سے کہنا پڑا کہ اگر وہ اردو سمجھ نہیں سکتے تو بعض معزز اراکین کی تقریر میں خلل نہیں ڈالنا چاہئے۔ اسپیکر نے یہ بات اس وقت کہی جبکہ شریمتی شاہجہاں بیگم اور وزیر مال مسٹر ڈی رنگا ریڈی سے اردو میں بعض ضمنی سوالات پوچھ رہی تھیں اور وزیر موصوف بھی اسی زبان میں جواب دے رہے تھے۔ اس پر ایک رکن موصوف اٹھ کھڑے ہوئے اور اسپیکر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جناب والا کیا ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔"

اسپیکر: آپ کو لطف اندوز ہونا چاہئے۔ جناب براہ مہربانی تشریف رکھئے۔ اس ایوان میں بعض معزز اراکین ایسے ہیں جو تلگو سے ناواقف ہیں۔ جب مباحث تلگو میں ہوتے ہیں تو وہ خاموشی سے سنتے ہیں آپ کو بھی چاہئے کہ جب دوسری زبان میں مباحث ہوں تو آپ بھی اسی خاموشی سے سنیں اور اس عمدہ بات چیت سے لطف اندوز ہوں۔ ہم سبھوں کو تحمل اور رواداری سے کام لینا چاہئے چونکہ خاتون ممبر کو تلگو نہیں آتی اس لئے آنریبل منسٹر صاحب کو اردو میں جواب دینے دیجئے۔

چیف منسٹر: مجھے اس کی کوئی فکر نہیں کہ دوسرے اس سے لطف اندوز ہوں یا خاموش رہیں۔ لیکن میں کہوں گا کہ کم از کم آنریبل اسپیکر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایوان میں کیا ہو رہا ہے اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ وضع کیا جانا چاہئے جس کے ذریعہ......

اسپیکر: ہر وقت مشکل یہی ہے یہاں تلگو کے بعد اردو ہی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے اور اسپیکر کو بھی طرح اردو نہیں آتی۔ مجھے تو صرف شد بد آتی ہے اور میں "جیتو" وغیرہ جیسے دو چار لفظ کہہ لیتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا ایسے میں آنریبل چیف منسٹر صاحب اور اسپیکر دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ بہرکیف ہمیں کسی نہ کسی طرح کام چلانا ہوگا۔

اردو نے ایک اہم زبان کا درجہ حاصل کر لیا

مدراس ۲۲ اپریل۔ چیف جسٹس مدراس ہائی کورٹ مسٹر پی وی راج منار نے آج شام اے جے اردو مباحثہ کی چوتھی سالانہ تقاریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو بلاشبہ ہندوستان کی ہی زبان ہے اور وہ ہند کی مختلف زبانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مسٹر راج منار نے کہا کہ انھیں بے حد مسرت ہے کہ ان چار برسوں کے دوران میں مباحثہ نے کافی ترقی کی ہے۔ اور اس خصوص میں سالانہ مشاعرہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جس میں ممتاز شعراء شرکت کرتے آئے ہیں۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے چیف جسٹس راج منار نے مزید کہا کہ مغل دور کی سرپرستی میں اردو نے ایک اہم زبان کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ زبان مختلف تمدنوں کے امتزاج کی نمائندگی کرتی ہے اور اس لئے وہ جنوب میں بھی اتنا ہی مقبول ہوئی جتنی شمال میں۔

اردو کی عظمت اور تلیگو کی اہمیت

وزیر حکومت مقامی آندھرا حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو ایک عظیم زبان ہے لیکن اردو والوں کو تلیگو کو فراموش نہ کرنا چاہئے اور نہ اس کی اہمیت گھٹانا چاہئے۔

انتخابی مہم میں اردو

انتخابی مہم کے سلسلے میں اردو کے جو پمفلٹ، پوسٹر اور نعرے استعمال ہوئے ہیں ان کی تفصیل اور نمونے بھیجنے کے لئے ہم نے ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے درخواست کی تھی۔ بعض حضرات نے زحمت فرما کر یہ چیزیں بھیجی ہیں ان میں سے کچھ ہم اپنے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے شائع کر رہے ہیں۔

ناگ پور سے عبدالغفور صاحب نے کانگرس اور ہندو مہا سبھا کے اردو پوسٹر وغیرہ بھیجے ہیں۔ کانگرس کیلئے تو دو بیلوں کی نشانی والے بکس میں ووٹ ڈالنے کے لئے عام اپیل کی گئی ہے جو عام طور پر ہر جگہ ہندوستان میں شائع ہوئی ہے۔

ہندو مہا سبھا کے مشہور کارکن اور مستقل عہدہ دار ڈاکٹر این۔ بی۔ کھرے کا دستی اشتہار حلقہ نمبر ۷ کے ووٹروں کے لئے اردو پریس نقل صاحب روڈ ناگ پور سے شائع ہوا ہے جس کی عبارت کا ایک ٹکڑا یہ ہے:-

"[illegible] میں برطانیہ کے عہد حکومت میں مسلمانوں کو فریضۂ حج کے لئے جہاز بند کر دیا گیا تھا۔ آپ کی کوششوں سے وائسرائے لارڈ ویول کو مجبور ہونا پڑا۔ اور انہیں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے دوبارہ جہاز شروع کرنا پڑا۔ اس وقت مسلمانان ہند نے آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ آپ انسانیت کے سچے خیر خواہ ہیں۔ اس وقت ہندوستان کی نازک حالت دیکھتے ہوئے آپ جیسے تجربہ کار شخص کو چن کر دینا مسلمانوں کو فرض ہو جاتا ہے۔ ایسا قابل شخص بمبئی قانون ساز اسمبلی میں ہونا لازمی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنا قیمتی ووٹ ڈاکٹر این بی کھرے کو دے کر انہیں خدمت کا موقع دیں گے۔"

پیٹی کی نشانی "گھوڑا سوار"

پنجاب سے تو اردو میں جہازی سائز کے پوسٹر، ہینڈ بل، اپیلیں، دال میں مراسلے وغیرہ بے شمار شائع ہوئے ہیں جناب دانش تونسوی نے تکلیف فرما کر کچھ چیزیں بھیجی ہیں اس ذخیرے میں بھی کانگرس، جن سنگھ وغیرہ کا اردو لٹریچر کافی ہے۔

جن سنگھ کے امیدوار پنڈت کرشن چند صاحب امرتسری نے جو پوسٹر شائع کیا ہے اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

اکالی اور کانگرسی پارٹیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اگر اکالی ننگی کرپان ہیں تو یہ کانگرسی غلاف میں بند ہوئی دو دھاری تلواروں سے کم نہیں۔ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔"

یوم اقبال

انجمن ترقی اردو سہسوان کی طرف سے بتاریخ ۲۱ اپریل ۵۷ء بوقت ۶ بجے شام بمقام مدرسہ فیض عام علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک جلسہ زیر صدارت حکیم عبدالقوی صاحب منعقد ہوا جس میں ابوالعلا سید تیغ احمد صاحب۔ سید محمد عالم صاحب وکیل۔ سید منظر احمد صاحب۔ سید مرتضیٰ حسین صاحب۔ محمد اسماعیل صاحب۔ نثار الحسن صاحب۔ سید المظفر صاحب۔ ڈاکٹر عنایت الرحمن صاحب وغیرہ حضرات نے شرکت کی۔

جلسے کا افتتاح علامہ مرحوم کی نظم "نیا شوالہ" سے ہوا۔ اس کے بعد نظمیں مقالے اور تقریریں ہوئیں۔ جلسہ صدر موصوف کے مقالے پر ختم ہوا۔

سہسوان کی تاریخ میں یوم اقبال کے سلسلے میں یہ پہلی تقریب ہے۔

سید شرافت حسین نگراں انجمن ترقی اردو سہسوان

نوجوانان حیدرآباد کی سماجی تنظیم مرکزی تعمیر ملت کی جانب سے ماہ مئی میں "یوم اقبال" اعلیٰ پیمانے پر منایا جا رہا ہے جس کی صدارت حکومت آندھرا پردیش کے وزیر داخلہ ڈاکٹر بی گوپال ریڈی صاحب فرمائیں گے جس میں ملک کے قابل اور مشہور افراد اپنے مقالے پیش فرمائیں گے۔ نیز اس موقع پر ایک نمائش بھی ترتیب دی جائے گی جو اقبال کی تصانیف اور ان پر لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ اقبال کے خطوط، آٹوگراف اور چغتائی کے مرقعے پر مشتمل ہوگی۔

معاصرین

اُردو علاقائی زبان

روزنامہ ناظم رام پور کے اداریہ مورخہ ۱۱۔ اپریل سے چند اقتباس :-

گزشتہ آٹھ نو سال سے یوپی میں اردو کے حقوق تلف کئے جاتے رہنے کا کانگریس کو یہ پھل ملا ہے کہ موجودہ انتخاب میں کانگریسی امیدواروں کو ان اضلاع میں بڑی طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جہاں اردو مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ بعض اضلاع ایسے ہیں۔ جہاں سے کانگریس کا نام و نشان مٹ گیا اور بعض اضلاع میں کانگریس کو کافی نقصان پہنچا۔ کانگریس کی شکست کے کچھ اور اسباب بھی ہیں۔ لیکن ان میں مرکزیت اور اہمیت اردو کو حاصل ہے۔ کیونکہ کانگریس کے مقابلے میں اُن سیاسی جماعتوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ جنہوں نے اردو کی علاقائی حیثیت تسلیم کرکے اس کے حقوق بحال کرانے کے لئے جدوجہد کی۔ اور حقوق نہ ملنے تک جدوجہد کرتے رہنے کا اعلان کیا پرجا سوشلسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی یوپی میں ہرگز اس قدر کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔ اگر اردو داں طبقے کا انہیں تعاون حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اردو کا مسئلہ ایک نئی قوت اور نئی طاقت کے ساتھ اُبھر کر کانگریس کے سامنے آیا ہے۔ تدبر اور مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ اردو کے مسئلہ کی ہمہ گیری کو ختم کرنے کے لئے اس کے جائز حقوق تسلیم کرنے کا اعلان کردیا جائے۔

حال ہی میں سوشلسٹ پارٹی کے چیرمین مسٹر گوپال نرائن سکسینہ نے اردو کے متعلق جو بیان دیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کامیابی کے بعد اپوزیشن نے اردو کے متعلق اپنے موقف میں تبدیلی نہیں کی ہے۔ بلکہ مخالف سیاسی پارٹیاں اپنی کامیابی کے لئے اردو کو سب سے بڑا ذریعہ سمجھتی رہیں۔

اب جبکہ یو۔ پی میں کانگریس نئی حکومت بنارہی ہے تو نئی حکومت کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ یو۔ پی میں کانگریس کے وقار کو دھکا کیوں لگا چنانچہ اس سلسلے میں وہ جب بھی سابقہ پالیسیوں پر غور کرے گی تو اس نتیجہ پر پہنچنا لازمی ہے کہ اردو کے ساتھ ناانصافی کا سلوک مزید نقصانات کا حامل ہوگا۔ حد بندی کمیشن کی رپورٹ کے بعد اردو کی رہی سہی مشکلات بھی ختم ہوگئی ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق اردو کو وہی سہولتیں حاصل ہونا چاہئیں۔ جو علاقائی اور سرکاری زبان کی حیثیت میں اردو کو حاصل ہوں گی۔ اگر یو۔ پی میں حد بندی کمیشن کی رپورٹ کو عملی جامہ پہنایا گیا جس کو عملی جامہ پہنانا لازمی اور ضروری ہے تو یہ مسئلہ حکومت کے لئے غور طلب ہے کہ محض ٹیکنیکل بنیاد پر اردو کو علاقائی زبان یا سرکاری زبان کا درجہ نہ دینا دانشمندی یا تدبر نہیں ہے۔ اگر نقلی الٹ پھیر سے مستقل خلش اور دیرپا منافرت ختم ہوسکتی ہے تو صوبہ کی سیاسی فضا کو صحت مند بنانے کے لئے حکومت کا یہ پہلا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اصلاحات کی تفصیلیں دینے کے بجائے اردو کے حقوق بحال کرنے کا ایک دم اعلان کرے۔

اردو مجلس

اردو مجلس انجمن ترقی اردو ہند حیدرآباد سے خصوصی تعلق رکھنے والا ایک ممتاز ادارہ ہے اس کی سالانہ رپورٹ بیاضت کے شکریے کے ساتھ شائع کی جارہی ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے بعد حیدرآباد کو اردو کا گہوارہ بننے کا فخر حاصل ہوا اور اسی مناسبت سے حیدرآباد میں اردو کی خدمت کا دعویٰ کرتے ہوئے کئی انجمنیں بھی قائم ہوئیں ان انجمنوں میں سے کتنی انجمنیں آج باقی ہیں اور انھوں نے آج تک کیا کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اس سے قطع نظر اردو مجلس، حیدرآباد کی ایک ایسی انجمن ہے جو اردو کی خدمت کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ ہر ماہ انتہائی باقاعدگی کے ساتھ اس کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں اور اس میں مختلف مکاتیب خیال کے افراد بلا لحاظ مذہب و ملت و سیاسی عقائد حصہ لے کر مختلف مسائل اور اردو کی ترقی و ترویج کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اس طرح اردو مجلس کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ "اردو کو بچاؤ" کا نعرہ بلند کرنے کے بجائے اردو کی خلوص و مفید اور عملی خدمت انجام دے رہی ہے اردو مجلس کی اردو نوازی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مالی وسائل کی کمی اور گوناگوں دشواریوں کے باوجود اس انجمن نے اپنی سالانہ بجٹ میں سے اردو ہال میں مائیکرو فون کے لئے دو سو روپے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

۲۹۔ دسمبر ۵۶ء کو اردو مجلس کے ایک عام اجلاس میں عہدہ داروں کا متفقہ طور پر انتخاب عمل میں آیا نواب سعید جنگ بہادر (صدر) مسٹر جانکی پرشاد (معتمد اعزازی شعبہ ادب) مسٹر سید محمود (معتمد اعزازی انتظامی) مسٹر احمد مرزا (خازن)، بیگم حبیب الرحمن شریک معتمد برائے شعبۂ خواتین اور مسٹر حبیب الرحمن رکن انتظامی مقرر ہوئے۔

۱۴- جنوری ۱۹۵۵ء کو اردو مجلس انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ چونکہ انجمن ترقی اردو اور اردو مجلس کے اغراض و مقاصد یکساں ہیں اس لئے دونوں ادارہ جات کی علیحدہ رکنیت ضروری نہیں ہے بلکہ آئندہ سے اردو مجلس کے ارکان کو بھی انجمن کا رکن بھی متصور کیا جائے۔ اس اجلاس میں مسٹر جانکی پرشاد نے انتظامی امور اور مسٹر سید محمود نے ادبی شعبہ کے معتمد کے فرائض انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء کے عام اجلاس میں ان تجاویز کی توثیق کر دی گئی۔ کامل ایک سال بعد یعنی ۲۲ جنوری ۵۶ء کو مجلس انتظامی کے نئے انتخابات کے لئے عام اجلاس منعقد ہوا جس میں مسٹر احمد مرزا نے سال گزشتہ کے مالیہ کی رپورٹ پیش کی اور وصولی چندہ کی دشواریوں پر روشنی ڈالی۔ مسرز محمد سلطان سجاد مرزا، عثمان سبحانی، اور پروفیسر ہارون خاں شروانی کے علاوہ دیگر ارکان نے اخراجات میں کمی کے لئے بعض تجاویز پیش کیں جنہیں منظور کیا گیا۔ مسٹر حبیب الرحمن کی تحریک پر مجلس انتظامی کے سابقہ اراکین کو بھی برسرکار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ البتہ مسٹر سجاد مرزا اور ڈاکٹر غلام یزدانی کو بھی مجلس انتظامی میں شریک کیا گیا۔

جنوری ۱۹۵۵ء سے مارچ ۱۹۵۷ء تک یعنی دو سال دوران میں اردو مجلس کے سب اجلاس منعقد ہوئے سربرآوردہ اصحاب نے مقالے پڑھے۔

پنڈت نہرو اور اردو

ہفت وار بیباک کے اداریہ کا آخری ٹکڑا

ابھی ابھی آل انڈیا ریڈیو کے زیر اہتمام لٹریری فارم کا افتتاح کرتے ہوئے پنڈت جی نے ایک نہایت حقیقت افروز تقریر ارشاد فرمائی ہے۔ پنڈت جی نے اپنی اس تقریر میں ادب کی عظمت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ ادیب اور زندہ ادب ملک و قوم کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کی واحد ضمانت ہے موصوف نے اپنی اسی تقریر میں فرمایا ہے:۔

" سماج اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایک زندہ ادب سماج کی زندگی کی صحیح تصویر ہوتا ہے۔ بیرونی ملکی ادب کو بھی کچھ مطالعہ کیا جانا چاہئے۔ ہمارے ملک میں متعدد زبانیں ہیں مگر ان کا منبع ایک ہے۔ ان زبانوں کے ادب اور ادیبوں میں گہرا تعلق ہونا چاہئے اس سے ملک مضبوط ہوگا اور آگے بڑھے گا۔"

پنڈت جی کے یہ ارشادات کس قدر واضح ہیں اور ان سے حقیقت کی جانب کتنی واضح اور صاف رہنمائی ہوتی ہے؟ لیکن اگر کانگریس کے اردو دشمن رہنماؤں سے پوچھا جائے کہ اس مفہوم میں اردو ادب بھی شامل ہے یا نہیں تو ان کی غیض کی زبان سے صاف انکار سنائی دے گا۔ اور اس جواب کو پنڈت جی بھی برداشت کرنے پر مجبور نظر آئیں گے افسوس یہ ہے کہ اردو، اردو ادب اور اردو زبان کے لئے آئین کی مقدس کتاب پر بھی سب کچھ ہے۔ کانگریس کی تاریخ بھی اس پر شہادتیں پیش کر سکتی ہے۔ اور پنڈت جی کے ارشادات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی اس کے لئے موجود ہے لیکن اردو کہاں ہے؟ اردو ادب کی سرپرستی اور ترقی کے لئے سرکاری ہندستان میں کیا ہو رہا ہے؟ اور اردو کو زندہ رکھنے کے لئے کون سی مشفقانہ کارروائیاں ہیں؟ ان سوالات کا عملی جواب آج بھی پنڈت نہرو کے ہندستان میں بجز مایوسی کے اور کچھ نہیں۔ اور ہم پریشان ہیں کہ یہ کیا مصیبت ہے کہ پنڈت جی کی آواز یہیں بے اثر کیوں ہے اور ان کے دور حکمرانی میں بھی بدنصیب اردو کا بھلا کیوں نہیں ہوتا؟ کیا ہم یہ مان لیں کہ یہاں پنڈت جی بھی بے بس ہیں اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ ان کے سامنے اردو مٹتی رہے، اور وہ اظہار ہمدردی ہی فرماتے رہیں؟ اگر ایسا نہیں تو کیا ہے؟ اردو غریب کے نصیب کیوں نہیں جاگتے؟

پنڈت جی اپنے یاران محفل سے کتنے ہی تنگ ہوں لیکن وہی آج کے ہندستان کے ترجمان ہیں اور ایسے سوالات احتجاج و فریاد کے رنگ میں انہیں کی بارگاہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

بھارت میں اردو کا مستقبل

روزانہ ہند سماچار جالندھر

۱۸- اپریل ۵۵ء کے مضمون کا ایک ٹکڑا۔

"یوجنا" ہفت روزہ مرکزی اخبار ہے جو پنج سالہ پلان، کمیونٹی پراجیکٹوں، تعمیر نو اور اصلاح دیہات کے متعلق معلومات مہیا کرتا ہے مگر مقام تعجب ہے کہ یہ اخبار صرف انگریزی اور ہندی میں پیش کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ مرکزی سرکار کے اپنے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ گرام سیوک، اور یوجنا سے جرائد اردو میں بھی شائع ہوں کیونکہ اسی ایک زبان کی وساطت سے سرکاری معلومات شمالی ہندستان کے عوام تک پہنچائی جا سکتی ہے اور اس طرح عوام اور سرکار کے درمیان رابطہ کی ایک ہموار راہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

کے مصداق مرکزی سرکار ہی بہتر طور پر بتا سکتی ہے کہ اصلاح دیہات اور تعمیر نو کا پروپیگنڈہ انگریزی زبان میں کس طرح شمالی ہندوستان کے دیہاتیوں کو راس آ سکتا ہے۔ بہر کیف خدا کا شکر ہے کہ یہ مرکزی جرائد فرانسیسی، جرمن، پولش یا دوسری بھاشاؤں میں شائع نہیں ہو رہے ہیں۔ اگر شمالی ہندستان کے دیہاتی فی الواقع انگریزی سمجھ اور جانتے ہیں تو پھر سمندر پار کی دوسری بھاشائیں بھی ان کے لئے اجنبی قرار نہیں دی جا سکتیں۔

غزل میں ردیف وقافیہ

(حالی کا ایک اقتباس)

جو لوگ شاعری کے فرائض پورے پورے ادا کرنے چاہتے ہیں وہ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعر کے سر انجام کرنے میں کوئی چیز ایسی مشکل نہیں جیسا مضمون شعر کے لئے مناسب قافیہ بہم پہنچانا اسی لئے جب کسی کو سخت وقت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا قافیہ تنگ ہو گیا۔ اسی قافیہ کی مشکلات سے بچنے کے لئے یورپ کے شعرا نے آخرکار ایک بلینک ورس یعنی غیر مقفی نکال لی ہے اور اب زیادہ تر وہاں اسی طرح کی نظم پر شاعری کا دارومدار ہے۔ ہمارے یہاں اس پر طرہ یہ ہے کہ قافیہ کے پیچھے ایک ردیف کا دم چھلا اور لگا لیا گیا ہے۔ اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے لیکن غزل میں اور خاص کر اردو غزل میں تو اس کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔ اگر تمام اردو دیوانوں سے غیر مردف غزلیں تلاش کی جائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔ پس جب کہ قافیہ اور ردیف کی گھاٹی دشوار گزار ہے تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابل گزر بنانا انہیں لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعری کا کمال محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس۔

جہاں تک سنگلاخ زمینوں کا استقرا کیا جاتا ہے ان میں یا تو ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جن میں باہم دگر کچھ مناسبت نہ ہو۔ مثلاً "تیر پشت آئینہ" "تیر پشت آئینہ"۔ شمس کی تیلیاں، گمس کی تیلیاں یا ردیف ایسی لمبی اختیار کرتے ہیں جو ایک آدھ سے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آ سکتی جیسے "فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں" "سر پہ طرہ بار گلے میں" "تھا، تمنگ، کچھ، کراں" وغیرہ کہ قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جس میں عمدہ مضمون بندھنا تقریباً ناممکن ہو اور بامعنی شعر نکالنا بھی نہایت مشاق و ماہر استادوں کے سوا عام شعرا کے لئے قریب قریب ناممکن کے ہو۔ ایسی زمینوں میں بڑا کمال شاعر کا یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیہ اور ردیف میں جو منافرت ہو وہ بظاہر جاتی رہے گویا تیل اور پانی کو ملایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں اور امیر خسرو کی انملوں میں کچھ تھوڑا سا فرق معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے "کھیر، چرخہ، ڈھول اور کتا" ان چار چیزوں کو اس طرح پیوند ملایا ہے ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا چلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

ایک شاعر "تمنگیر" اور "پشت آئینہ" کو اس طرح پیوند دیتا ہے ؎

آرسی پہنے ہوئے وہ گل جو لیوے شیخ کا
ہم انگوٹھے کو کہیں تمنگیر پشت آئینہ

ایک اور شاعر نے کل اور مکھی کو اس طرح گانٹھا ہے ؎

صنعت الجنت چین دیکھ لا جاکر تو
دیکھئے گر تجھے منظور ہو کل کی مکھی

اس پر قیاس کر لینا چاہئے کہ کل سنگلاخ زمینوں میں اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ دو بے جوڑ چیزوں میں میل ثابت کیا جائے۔ پس شاعر کو چاہئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں گھٹتی کم کرنی چاہئیں اور صرف محض قافیہ پر قناعت کرنا چاہئے۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہئے جس کے لئے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے زیادہ الفاظ موجود ہوں ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا قافیے مضمون کے تابع نہ ہوں گے۔ جتنے نامور شعرا گزرے ہیں انھوں نے یہی اصول ملحوظ رکھا ہے اور ہمیشہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جن میں ہر قسم کے مضمون کی گنجائش ہو۔

(مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۰۰) (مرسلہ خلیل الرحمن اعظمی)

آج کا تیلگو افسانہ

(شری کے۔ وشوا ناتھن)

بھارت کی دیگر زبانوں کے ادب کی طرح تیلگو ادب میں بھی ناول اور مختصر کہانی کو جنم لئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ شری کے وریہ سالنگم نے سب سے پہلے تیلگو میں کہانیاں اور ناول لکھے اور بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید تیلگو ادب کی بنیاد انھوں نے ہی رکھی انھوں نے تیلگو نثر کے طرز تحریر کو سنسکرت کے غلبے سے آزاد کیا تاکہ عام لوگ اسے سمجھ سکیں۔ شری چلا کا مرشی بھوجرجی اور شری گیتھو راپو لکشمی نے بھی ان کی پیروی کی۔

۱۹۲۰ء کے بعد ناول کی جگہ مختصر کہانی نے لینی شروع کر دی۔ سیاسیات، اقتصادیات اور سماجی تبدیلیوں کے عمل نے نئے مسائل پیدا کر دیے اور انشا پردازوں کو قدرتی طور پر ان موضوعات پر قلم اٹھانی پڑی۔ اس طرح ادب کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ کاشتکار اور غریب لوگ بھی ادیبوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

تیلگو میں مختصر کہانیاں لکھنے والوں میں چنتا ستکر دکشیتو، وکا پتی، کوٹی سرات وشوا ناتھ ستیا نارائن اور چم راجو وغیرہ انشا پردازوں کے نام قابل ذکر ہیں۔ تیلگو میں ہر سال اوسطاً ایک ہزار سے زیادہ کہانیاں شائع ہوتی ہیں جن کے موضوعات عام طور پر معاشی غیر مساوات اور جنسی مسائل ہوتے ہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں کمیونسٹوں کے اثر و رسوخ میں کچھ اضافہ ہوا اور تیلگو میں بھی ترقی پسند ادیب وجود میں آنے لگے ان کی کہانیوں کا نظریہ پراپیگنڈہ کرنا تھا لیکن انھوں نے اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ زمانہ بعد از جنگ کے انشا پردازوں نے مختصر کہانیاں لکھنے والے روسی اور چینی ادیبوں کو نمونے کے طور پر سامنے رکھا۔

تیلگو کہانیوں کی خصوصیت کے بارے میں یہ بات فخر سے کہی جا سکتی ہے کہ عام طور پر ان کا آغاز نہایت اچھا ہوتا ہے لیکن ان کے انجام کے بارے میں یہی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ان کہانیوں کا انجام عام طور پر قدرتی معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم نفسیاتی پہلو سے ان کا معیار بہت بلند ہوتا ہے۔

ہماری زبان کا سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ فی پرچہ ۱۰ آنے اور منی آرڈر سے صرف ۲۰ آنے صرف آتا ہے

کتابیں ملیں

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

قرآن مجید کی مصور آیتیں مصنف:۔ ابو محمد مصلح

حجم ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۲ کاغذ اچھا قیمت ۸ آنے

ایورسٹ کی فتح (تیسری اور چوتھی جماعت کے لئے)

مصنف:۔ اطہر پرویز ناشر مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

حجم ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۰ کاغذ اچھا قیمت ۷ آنے

خیال:۔ اپریل (رسالہ) پہلا سال شمارہ نمبر ۱۔

مدیر:۔ فیض انصاری و محمد علیم الدین بی۔ اے

مقام اشاعت کاشی حجم ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۴۰۔

کاغذ اچھا قیمت فی پرچہ پانچ آنے

شوکت لٹریری ایسوسی ایشن

۱۲۔ اپریل کی شب شوکت لٹریری ایسوسی ایشن کا مشاعرہ امیر علی خاں صاحب لیکچرار ایم۔ اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ کرنول کی صدارت میں ہوا۔

مشاعرے کا آغاز انور پاشا انور کی نعت سے ہوا۔ بیرونی شعراء میں حضرت یاسط صاحب اختر ایڈووکیٹ و بہار کوم نے شرکت فرمائی مقامی شعراء میں اقبال احمد اقبال، انور پاشا انور، یوسف شاد، نادر رومانی، سمیع الزماں خاں ذاکر، غازی، محمود رشتی البخاری رشتی، ابوالکمال محمد مرتضیٰ اور عبدالرحیم راہی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

([illegible] نیشنل پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا)